منصبِ اِفتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں(۳)

تحریر : محمد المکی ناصری' ترجمہ : پروفیسر نور احمد شاہتاز

فتویٰ کے سلسلہ میں مفتی کو کیا کیا کوششیں کرنی چاہئیں

مفتی کے پاس جیسے ہی کوئی سوال آئے تو اسے اس کا جواب دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے' بلکہ اس کے اور مستفتی کے مفاد میں یہ ہے کہ مفتی اس سوال پر خوب غور و فکر کے لئے کافی وقت دے اور اس کے تمام اجزاء و عناصر پر اول سے آخر تک گہری نظر ڈالے' تاکہ فتویٰ دینے میں کہیں کوئی تساہل اس سے منسوب کر کے اسے لاپرواہوں کی صف میں اور ایسے لوگوں کے زمرے میں شامل نہ کر دیا جائے جن کے فتاویٰ لائق اعتبار نہیں۔ چنانچہ اسے مندرجہ ذیل کوششیں فتویٰ دیتے وقت کرنی چاہئیں :

۱۔ فتویٰ تحریر کرنے سے قبل مستفتی کے سوال کو غور سے پڑھا جائے اور اس کے الفاظ پر غور کر کے جواب اسی کے الفاظ کے مطابق لکھا جائے' کیونکہ مستفتی اگر پڑھا لکھا نہیں تو اس کے الفاظ کا صحیح مفہوم ممکن ہے مفتی سرسری نظر سے نہ جان سکے' یا یہ کہ جو الفاظ سائل نے استعمال کئے ہیں عرف عام میں ان کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہو۔ چنانچہ مفتی کو جواب میں ایسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو معروف ہوں اور جن سے سوال کا واضح اور صحیح جواب مستفتی کی سمجھ میں آسکے۔ اور اگر مفتی بلا غور و خوض اور الفاظ میں تامل کے بغیر فتویٰ نویسی شروع کر دے گا تو یہ فتویٰ خلاف شرع ہوگا کہ مستفتی کا مافی الضمیر سمجھے بغیر لکھا گیا۔(۲۵)

۲۔ مفتی کا جواب خلاف واقع نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مفتی سائل سے اس کے شہر یا گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور جواب اسی کے شہر و گاؤں کے عرف کے مطابق دے' کیونکہ مختلف علاقوں میں عرف مختلف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مفتی عرف کا لحاظ رکھے اور اپنے ہی شہر کے عرف کے مطابق فتویٰ نہ دے کہ ہر شہر کا عرف خاص حکم شرعی رکھتا ہے۔(۲۶)

۳۔ جواب مستفتی کی غرض و غایت سمجھنے کے بعد لکھا جائے اور تفصیلات جاننے کے لئے اس سے استفسار کیا جائے تا کہ موضوع کی وضاحت ہو سکے۔ اور اگر موضوع کی تفصیلات جاننا ضروری ہوں تو یہ تفصیلات جاننے کے بعد ہی جواب تحریر کیا جائے تا کہ ہر طرح کے احتمالات و اشکالات سے پاک جواب لکھا جا سکے۔(۲۷)

۴۔ مفتی کا جواب حق و صواب کے مطابق ہو' تا کہ مستفتی کو اس کے نتیجہ میں کسی ملامت و عتاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مفتی کو سوال کی اچھی طرح چھان پھٹک کرنی چاہئے کیونکہ ہر سائل کی نیت واقعتاً اس کا جواب حاصل کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ ایسے سائل بھی آجاتے ہیں جو اس سوال کے جواب کے نتیجہ میں اپنا کوئی اور الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں' یا مفتی کو الجھانا مقصود ہوتا ہے' یا اس کے ذریعہ اپنے دیگر مقاصد کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر سائل کے سوال کو حسن نیت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا۔ مفتی اگر ان امور کا خیال کئے بغیر فتویٰ دے گا تو خود بھی گرفتار بلا ہو گا اور دوسروں کو بھی مبتلائے عذاب کرے گا۔ اس صورتحال کو حسب ذیل مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔(۲۸)

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال بھی آ سکتا ہے جو دو ایسے مسائل پر مشتمل ہو کہ جن کی صورت ایک جیسی ہو مگر حکم مختلف ہو۔ اور یوں ان میں سے ایک تو صحیح و جائز کے قبیل سے ہو جبکہ دوسرا باطل و حرام کے قبیل سے' اور اس کی وجہ پہلے اور دوسرے مسئلہ کی حقیقت میں اختلاف پایا جاتا ہو۔ اب اگر مفتی ذہانت سے کام نہ لے اور اس کی نظر صرف ایک ہی صورت پر ہو تو وہ ان دونوں کی حقیقت سے تجاہل کی بناء پر دونوں پر ایک ہی حکم لگائے گا اور یوں حکم صحیح کے مخالف فتویٰ دے ڈالے گا کیونکہ اس نے ان دو امور کو جمع کر دیا جن میں اللہ نے فرق رکھا ہے۔

کبھی مفتی کے سامنے ایسا سوال بھی آ سکتا ہے جو مجمل ہو مگر اس کے اجمال میں متعدد انواع ہوں' چنانچہ مفتی کا ذہن کسی مخصوص نوع کی طرف جا سکتا ہے اور کسی دوسری نوع سے اس کا ذہن غافل بھی رہ سکتا ہے اور ممکن ہے وہی نوع مستفتی کے نزدیک زیادہ اہم اور مقصود بالذات ہو۔ چنانچہ اگر مفتی اجمال کی تفصیل جانے بغیر فتویٰ دے گا اور ابتداء ہی میں سائل کا قصد معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے گا تو جواب تحریر کرنے میں وہ کسی ایسی

صورت کو اختیار کر سکتا ہے جو صواب سے دور تر ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک صورت مفتی کو پیش آسکتی ہے اور وہ یہ کہ مفتی کے سامنے ایک ایسا سوال آئے جو اصلاً باطل ہو مگر خوبصورت الفاظ اور شگفتہ تحریر کے لبادے میں پیش آگیا ہو (۲۹) اور اگر مفتی اس مکرو فریب کی طرف متوجہ نہ ہو جو اس میں ملفوف ہے اور جواب دینے میں جلدی کرے تو وہ محذورات میں جا پڑے گا۔

ایسے ہی موقع کی مناسبت سے القرافی نے کہا ہے کہ مفتی کو بہت چوکنا رہنا چاہئے' کیونکہ بسا اوقات باطل کو حق کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے مگر اس سے اصلاً مقصود باطل ہی ہوتا ہے۔ (۳۰)

مفتی ہوشیار باش

مفتی کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں اس کے پھسل جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مفتی کو ایسی پھسلن (Slipping) سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ اگر کسی مسئلہ میں دو قول ہوں' ایک قول تخفیف (نرمی) کا اور دوسرا تشدید (سختی) کا تو مفتی کو شدت کے قول پر فتویٰ نہ دینا چاہئے۔ اسی طرح عوام کو تشدید کے قول پر اور خواص کو تخفیف کے قول پر فتویٰ دینا بھی درست نہیں جبکہ اس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی شرعی جواز بھی نہ ہو {۳۱} کیونکہ ایسا کرنا ایک طرح کا فسق ہے' پھر دین میں خیانت بھی ہے اور مسلمانوں سے دھوکہ بھی {۳۲}۔ اسی طرح مفتی کو باطل شبہات کی بناء پر اپنی فاسد اغراض کے پیش نظر فتویٰ نہ دینا چاہئے اور نہ ہی ذاتی منفعت کی خاطر حرام و مکروہ قسم کے حیلے بہانوں سے تخفیف کرنی چاہئے۔

اسی طرح اسے کسی ایسے شخص کو مشکل اور تنگی میں نہ ڈالنا چاہئے جس سے اسے کبھی نقصان پہنچا ہو' گویا مفتی کو یوں اپنے منصب سے گر کر فتویٰ نہ دینا چاہئے۔ ہاں مگر جو اپنے دین و ایمان کو اتنا ہی حقیر و کمتر جانے تو وہ اس قسم کی حرکت کر گزرے گا مگر اس کے بعد فتویٰ دینے کا مطلقاً مجاز نہ ہوگا۔ {۳۳}

اگر کسی ایک مسئلہ میں متعدد اقوال ہوں اور مفتی میں ان اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی استعداد نہ ہو تو اسے یونہی اندازے سے فتویٰ دینے کا حق نہیں کہ وہ جسے

چاہے جس قول کے مطابق فتویٰ دے ڈالے' کیونکہ اسے شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ اپنی منفعت اور ذاتی پسند ناپسند کو مختلف اقوال میں معیار ترجیح ٹھہرائے اور اپنے پسندیدہ افراد یا دوست احباب کو تو اس قول کے مطابق فتویٰ دے جس سے اس کی غرض پوری ہو جائے اور دیگر لوگوں یا مخالفین کو اس کے برعکس قول کے مطابق فتویٰ دے' تاکہ انہیں ضرر اور نقصان پہنچے۔

قاضی ابوالولید الباجی اپنے دور کے ایک مفتی (جو کہ اپنی منشاء و مرضی کے مطابق فتویٰ دیا کرتا تھا) کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اہل اسلام میں اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس پر اجماع ہے کہ اس طرح فتویٰ دینا جائز نہیں"۔ کیونکہ یہ تو شریعت سے مذاق ہوگا اور اس پر اصرار کرنا یا قائم رہنا بدتر فسق اور اکبر الکبائر گناہ ہے {۳۴}۔ ہاں اگر مفتی کسی شرعی مصلحت کی بناء پر سائل کو ایسا فتویٰ دے جس میں شدت ہو اور اس کے پاس اس کی تاویل بھی ہو تو تادیب و تنبیہ کے اعتبار سے جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے کسی نے قاتل کی توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی جبکہ ایک اور شخص نے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے اپنے دونوں اقوال پر مبنی دو مختلف و متعارض جوابات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: پہلا شخص جسے میں نے کہا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی اس کی آنکھوں سے ارادۂ قتل ٹپک رہا تھا' سو میں نے اسے قتل سے باز رکھنے کی غرض سے یہ کہا۔ جبکہ دوسرا قتل کرنے کے بعد نادم ہو کر مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا تو میں نے اسے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کیا۔ {۳۵}

مفتی کو چاہئے کہ جب اس کے اخلاق میں تبدیلی اور مزاج میں حد اعتدال سے تجاوز آ جائے جو گھریلو معاملات و تفکرات کی بناء پر ہونا ممکن ہے تو وہ ایسے حالات میں فتویٰ نہ دیا کرے۔ ہاں اگر وہ خارجی عناصر کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے تو ایسی صورت میں اس کے فتویٰ دیتے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ {۳۶}

مفتی کو چاہئے کہ وہ منصب افتاء سنبھالنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لے کہ اس کے پاس اپنی ضروریات زندگی کے لئے بقدر کفایت سامان بود و باش ہے؟ بصورت دیگر

لوگ اس کی معاشی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور مال و دولت کا لالچ دے کر اسے اپنے دباؤ میں لے آئیں گے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے لئے ترنوالہ ثابت ہو گا اور اس مال کا خواہش مند رہے گا جو اوروں کے پاس ہے۔ مفتی کو چاہئے کہ وہ اپنے گزر بسر کا اہتمام دیگر جائز ذرائع آمدن سے کرے اور فتویٰ کا کام محض فی سبیل اللہ انجام دے۔ مفتی کو چاہئے کہ اگر اس کے پاس بقدر کفایت سامان زیست نہ ہو تو حاکم سے وظیفہ قبول کر لے۔ اور حاکم کو چاہئے کہ وہ مفتی کا وظیفہ مقرر کرے تاکہ اس سے اس کی ذاتی ضروریات پوری ہو سکیں {۳۷} اور وہ اس وظیفہ کے عوض افتاء کی خدمات انجام دے سکے جو کہ فرض کفایہ بھی ہے اور مصالح عامہ میں سے ایک اہم ضرورت بھی۔

حافظ ابو بکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الفقیہ والمتفقۃ" میں لکھا ہے کہ : "حاکم کو چاہئے کہ وہ تدریس فقہ اور منصب افتاء پر فائز اشخاص کے وظیفہ کا انتظام کرے تاکہ انہیں اپنی ضروریات کے لئے کوئی کاروبار نہ کرنا پڑے۔ مفتی کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جانا چاہئے"۔ پھر خطیب بغدادی نے اپنی سند سے ایک روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس قسم کی خدمات انجام دینے والے ہر شخص کو سو (۱۰۰) دینار سالانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ {۳۸}

(جاری ہے)

حواشی

{۲۵} ایضاً ص ۲۵۲ {۲۶} ایضاً ص ۲۴۹

{۲۷} ابن القیم 'اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۶۳ {۲۸} القرافی 'الاحکام ص ۲۵۹

{۲۹} ایضاً جلد ۴' ص ۱۶۳۔۱۶۷۔۱۶۹ {۳۰} ایضاً ص ۲۵۷

{۳۱} النووی 'المجموع ج ۱' ص ۴۱ {۳۲} القرافی 'الاحکام' ص ۲۶۹

{۳۳} ابن فرحون 'البقرہ' ج ۱' ص ۵۱۔ نیز ابن القیم 'اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۹۳۔
النووی 'المجموع' ج ۱ ص ۴۶ 'التسولی' ج ۱' ص ۲۴

{۳۴} ابن القیم 'اعلام الموقعین' ج ۴ ص ۱۸۳' ۱۸۴

{۳۵} النووی 'المجموع' ج ۱' ص ۵۰ بحوالہ الصمیری

{۳۶} النووی 'المجموع' ج ۱' ص ۴۶۔ ابن القیم 'اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۹۸

{۳۷} ابن القیم 'اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۷۸۔ نیز اللقانی اصول الفتویٰ قلمی نسخہ' ص ۸۴

{۳۸} النووی 'المجموع' ج ۱' ص ۴۶

امام احمد بن شعیب نسائیؒ

۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ

عبدالرشید عراقی

صحاح ستہ کے پانچویں رکن امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی ہیں۔ آپ کا تعلق خراسان کے شہر نساء سے تھا۔ خراسان کا علاقہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے {۱} نساء خراسان کے شہر مرو کے قریب واقع ہے {۲}۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

امام نسائی ۲۱۵ھ میں نساء میں پیدا ہوئے۔ امام نسائی نے خود اس کی تصریح کی ہے کہ میری پیدائش ۲۱۵ میں ہوئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: "یشبہ ان یکون مولدی فی سنۃ ۲۱۵ھ" (اندازہ ہے کہ میری پیدائش ۲۱۵ھ میں ہوئی) {۳}

ابتدائی تعلیم امام نسائی نے کہاں حاصل کی' اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن اس زمانہ میں خراسان کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا۔ خراسان میں اصحاب علم وفضل کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اس لئے قیاس یہی ہے کہ امام نسائی نے ابتدائی تعلیم خراسان ہی میں حاصل کی ہوگی {۴}

تحصیل حدیث کے لئے سفر

امام نسائی نے جس دور میں جنم لیا' اس وقت علم حدیث کی تحصیل کے لئے گھربار چھوڑنا اور دور دراز ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار بن چکا تھا' جس کا آج اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے

مختلف ممالک کا سفر کرنا علمائے کرام کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ اسی ضابطہ کے تحت امام نسائی نے حجاز' عراق' مصر' شام' اور جزائر کے سفر کئے۔ اپنے ان اسفار کا آغاز انہوں نے ۱۵ سال کی عمر میں کیا اور سب سے پہلے امام حدیث قتیبہ بن سعید (م ۲۴۰ھ) کی خدمت میں بلخ حاضر ہوئے {۵} بلخ میں ۱۴ ماہ قیام {۶} کے بعد آپ نے عراق' حجاز' شام' جزیرہ اور مصر کے سفر کئے اور ہر جگہ اساطین فن سے استفادہ کیا{۷}۔

مصر میں مستقل سکونت

مختلف ممالک میں تحصیل علم کے بعد امام نسائی نے مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مصر کو اپنے علوم کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا۔ جیسا کہ امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں : "تکمیل تعلیم کے بعد امام نسائی نے مصر میں مستقل سکونت اختیار کی' اور مصر کو اپنے علوم کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا"{۸}

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں : "در مصر مسکن داشت و تصانیف درون دیار منتشراست و مردم بسیار از و اخذ و تحمل حدیث کردہ اند۔ پس از مصر بدمشق آمد"{۹} (انہوں نے مصر میں سکونت اختیار کی اور ان کی تصانیف ملک بھر میں پھیلیں اور بہت سے لوگوں نے امام صاحب سے اخذ و روایت حدیث کیا۔ اور آخری عمر (۳۰۲ھ) میں مصر سے دمشق آ گئے تھے۔)

اساتذہ و تلامذہ

امام نسائی کے اساتذہ و تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان کے اساتذہ و تلامذہ میں اساطین فن شامل ہیں۔ مشہور اساتذہ یہ ہیں : امام اسحاق بن راہویہ' امام قتیبہ بن سعید' امام محمد بن بشار' امام محمد بن نصر مروزی' امام یونس بن عبداللہ الاعلیٰ اور محدثین صحاح ستہ میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری اور امام ابوداؤد سجستانی۔{۱۰} اور آپ کے مشہور تلامذہ یہ ہیں : امام ابن السنی' امام محمد بن قاسم الاندلسی' امام ابو جعفر طحاوی' امام ابو عوانہ اور امام ابو علی کنانی۔{۱۱}